اقبال اور اُردو زبان

ڈاکٹر سعید اختر درانی

اُردو زبان اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ برصغیر کے بڑے بڑے شعرا اور ادیب اس سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے کلام نظم ونثر کے اظہار کا ذریعہ اس زبان کو بنایا۔ علامہ اقبال کی شاعری کی ابتدا بھی اُردو زبان ہی میں ہوئی۔ اقبال کا تعلق پنجاب سے ہونے کے ناتے اُن کی زبان پر بعض اعتراضات بھی اُٹھائے گئے۔ حاجی محمد خاں بی اے (علیگ) پہلے فرد ہیں جن کی تحریر میں اہل پنجاب کے اُسلوب پر تنقید کی گئی۔ بعدازاں دہلی ولکھنؤ سے تعلق رکھنے والے حلقۂ ادبا نے اس بحث کو طول دیا اور اقبال کی صحت زبان بھی موردِ تنقید ٹھہری۔ اس مضمون میں اقبال کے حوالے سے اُٹھائی جانے والی اس بحث کو پیش کیا گیا ہے جس میں خود اقبال نے بھی اہلِ پنجاب کی زبانِ اُردو کے حوالے سے ایک مدلل مضمون قلم بند کیا۔

جناب حاجی محمد خاں[1] نے ''پنجاب میں اُردو'' کے عنوان سے ایک مضمون میں پنجاب کے اُبھرتے ہوئے شعرا شیخ محمد اقبال اور خوشی محمد ناظر کی زبان پر کچھ اعتراضات کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا:

پنجابیوں کا طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کچھ ایسا روکھا پھیکا ہوتا ہے کہ دل نشین نہیں ہوسکتا۔ سیدھے سادے بے تکلف طرزِ ادا کی جگہ بھدے اور اُلجھے ہوئے الفاظ اور جُملے ملتے ہیں، جن سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ لکھنے والے کو زبان پر قدرت نہیں ہے..... (اُن کی تحریروں میں) ہم کمزور، پھُس پھُسے اور بے ربط فقرے پاتے ہیں۔ محاورات کے بجائے فارسی، عربی لغت کی بوچھاڑ ہماری طبیعت کو بدمزہ کردیتی ہے۔ ''میں نے پڑھنا ہے'' اور ''میں نے بی اے پاس کیا ہوا ہے'' ہمارے کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ غرض اہل پنجاب کی ایک بھی ایسی اُردو تصنیف نظر نہیں آتی، جسے کوئی اہلِ زبان پڑھ کر خوبیِ زبان کا قائل ہو۔ مجھے پنجاب کے اُردو لٹریچر کی یہ ناگوار صورت مطلق طمانیت بخش معلوم نہیں ہوتی۔[2]

اِس مضمون کا چھپنا تھا کہ ہندوستان کی اُردو دنیا میں ایک سرے سے دوسرے تک گویا ایک بھونچال آ گیا۔ اگلے چند ماہ میں پنجاب کی اور بالخصوص اقبال اور ناظر کی، اُردو زبان کی صحت اور عدم صحت کے

بارے میں موافق و مخالف آرا اور مضامین کا ایک طوفان آ گیا۔ پنجاب مخالف آرا کے اُچھالنے والوں میں جناب حسرت موہانی (جنھوں نے جولائی ۱۹۰۳ء میں اپنے رسالے اُردوئے معلیٰ کی بنیاد رکھی تھی)، جناب برج نارائن چکبست، ایک نقاب پوش نقاد بنام ''تنقیدِ ہم درد'' (جو غالباً حکیم برہم فتح پوری تھے) اور مدیرِ اودھ پنچ وغیرہ پیش پیش تھے۔ پنجاب اور اقبال و ناظر کے حامیوں میں سید ممتاز علی، مولانا الطاف حسین حالی، جناب اسلم جیراج پوری، جناب وجاہت صدیقی جھنجھانوی، گورنمنٹ کالج لاہور کے استاد مرزا محمد سعید دہلوی اور اُن کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں (جو اُن دنوں حیدرآباد دکن میں ایک رسالے دکن ریویو کے ایڈیٹر تھے) اور جناب سید نذیر حسین نیرنگ انبالوی بالخصوص اہمیت رکھتے ہیں بلکہ خود شیخ محمد اقبال نے مخزن لاہور، اکتوبر ۱۹۰۳ء میں ایک بڑا مدلل اور محقق مضمون بہ عنوان: ''اُردو زبان پنجاب میں'' شائع کیا۔[۳]

مولانا حالی نے ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کو ایک تار کے ذریعے لکھا:

اہل دہلی و لکھنؤ چاہیں جو کچھ کہیں، مگر ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ دہلی و لکھنؤ کے بجائے اُردو کا مرکز لاہور ہو جائے گا، جس طرح عربی، عرب سے نکل کر مصر و شام میں چلی گئی، اِسی طرح اُردو، دہلی و لکھنؤ سے نکل کر پنجاب میں آ جائے گی۔[۴]

سید ممتاز علی صاحب (پ: سہارن پور، یوپی) نے تو یہاں تک لکھ دیا:

سوائے چند مضامینِ خاص کے، جن کا تعلق خانہ داری اور تلقین و تربیت مادری سے ہے [ایک اور جگہ سیّد صاحب نے انھیں ''سوائے چکی چولہے کے چند الفاظ کے'' لکھا ہے]، اور جن کا اِکتساب مستوراتِ اہل زبان کی سوسائٹی کے سوا ممکن نہیں، اور دیگر مضامین میں اہلِ پنجاب اُسی بے تکلفی اور سہولت سے اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں، جس طرح اہلِ زبان کرتے ہیں۔[۵]

انھی دنوں سیّد صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا:

مسٹر [طامس] آرنلڈ صاحب بہادر [پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور] اور شمس العلماء مولانا محمد شبلی کی انجمنِ ترقی اُردو کا چرچا آج کل تقریباً سب نامی اخباروں میں ہو رہا ہے..... [علی گڑھ، دہلی اور لکھنؤ پر غور کرنے کے بعد، ہماری نظر میں] اُردو زبان کو ترقی دینے کی کوششوں کا مرکز بننے کے لیے بجز لاہور کے اور کوئی مقام زیادہ موزوں و مناسب معلوم نہیں ہوتا۔[۶]

ایسے بدعت آمیز (Heretical) الفاظ کا شائع ہونا تھا کہ اُردو کی جنم بھومی، یا کم سے کم ٹکسالی، شہروں اور صوبوں کی رگِ عصبیت جوشِ خون سے پھٹنے کے قریب جا پہنچی اور وہاں کے باسیوں نے سوچا کہ ارے، کل تک تو یہ زبان خاص ہماری مِلکیت اور ایجاد اور پہچان تھی۔ یکا یک یہ چھٹ بھیئے (Johnny-come-lately) پنجابی کہاں سے اس کے دعوے دار بن کر آ ٹپکے ہیں؟ بلکہ وہاں کے بعض نعرہ بازوں نے تو یہاں تک لکھ دیا

کہ ایسی بھونڈی اور غلط سلط زبان کے لکھنے اور بولنے سے تو یہی بہتر ہے کہ پنجاب والے اُردو زبان کا لکھنا پڑھنا ہی ترک کر دیں۔ یعنی ''کہاں گنگا جمنا کا پوتر جل، اور کہاں یہ راوی کا گدلا پانی۔''

یہاں اقبال کی زبان پر اعتراض کرنے والوں کے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں جو اس سلسلہ بحث کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں:

۱- پنڈت برج نارائن چکبست لکھنوی ''کلامِ اقبال'' کے عنوان کے تحت رقم طراز ہوئے:

نومبر ۱۹۰۳ء کے مخزن میں شیخ محمد اقبال صاحب ایم، اے کا ایک قصیدہ نواب بہاولپور کے جشنِ تاج پوشی کی تہنیت میں شائع ہوا ہے۔ اڈیٹر مخزن نے اس قصیدہ کو حضرتِ اقبال کی ''طبع خداداد'' کے زور کا اعلیٰ نمونہ مانا ہے۔ پنجاب کے اور اخباروں نے بھی اس کی تعریف میں دریا بہا دیے ہیں، لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو..... اس میں ایسی لغزشیں موجود ہیں جن سے کہ مصنف کا عجز ثابت ہوتا ہے۔[۷]

اس کے بعد حضرتِ چکبست نے اقبال کے خاص خاص شعروں پر حرف گیری کی ہے، اگرچہ چند اشعار کی تحسین بھی کی ہے۔

۲- ''تنقیدِ ہمدرد'' (فتح پور ہنسوہ کے حکیم عبدالکریم برہم؟) ''اُردو کے نادان دوست'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

رہا پشاور اور لاہور کی زبان کا معاملہ، سو، اگر وہاں کے لوگ اپنی کمزوریِ زبان کی اصلاح کے بجائے خواہ مخواہ اس کی خوبی پر اصرار کرتے ہیں تو ہمارے نزدیک اس پر بھی صحیح اُردو کا اِطلاق کسی طرح پر نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی اُردو کا استعمال طوعاً و کرہاً نثر میں جائز بھی سمجھ لیا جائے، لیکن نظمِ اُردو ہمیشہ اس قسم کی آمیزش سے پاک رہی ہے، اور اب بھی رہے گی۔ اُسے رہنا چاہیے۔[۸]

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:

پس اگر اہلِ پنجاب میں سے کسی کو استادی کا دعویٰ ہو، اور ساتھ ہی وہ ذوقِ [سلیم] بھی اپنے ساتھ لایا ہو تو بے شک اُسے انگریزی محاوروں کے ترجموں کا حق حاصل ہے۔ ورنہ..... اِسی قسم کے بیسیوں جُملے جو پنجابی اخباروں اور وہاں کے معزز رسالوں میں شائع ہوا کرتے ہیں، ان کی اس کے سوا اور کیا وُقعت ہوسکتی ہے کہ وہ حقارت کی نظر سے دیکھے جائیں، اور زبان دانانِ دہلی و لکھنؤ اُن کو ٹھوکر لگا کر اُردو کے دائرے سے خارج کر دیں.....[۹]

۳- مولانا سیّد فضل الحسن حسرت موہانی ''تنقیدِ مخزن'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

ماہِ اگست [۱۹۰۴ء] سے اِس رسالے [مخزن] کی ظاہری حیثیت میں کچھ ترقی ہوئی ہے، لیکن افسوس کہ زبان کے معاملے میں اس کی حالت ہنوز ابتر ہے۔ چنانچہ اگست کے پرچے کو سرسری طور پر دیکھنے سے مفصلہ [ذیل] غلطیاں نظر سے گزریں.....[۱۰]

آخر میں تحریر کرتے ہیں:

ہم نے دانستہ اِس قسم کی غلطیاں زیادہ تر چھانٹی ہیں جو پنجاب کے تمام اخباروں اور رسالوں میں یکساں نظر آتی ہیں۔ اس بار ہم نے صرف ان غلطیوں کو معمولی صورت میں پیش کیا ہے۔ آئندہ اِن شاء اللہ تعالیٰ ان کی بابت مفصل اور مدلل طور پر کچھ لکھیں گے۔[۱۱]

پھر جنابِ حسرت نے تحریر فرمایا:

حضرتِ اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں۔ کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں، ویسی ہی نثر میں بھی کرتے۔ کیونکہ ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ اِسی پرچے (مخزن لاہور، اکتوبر ۱۹۰۴ء) میں اُن کے لکچر موسوم بہ ''قومی زندگی'' میں بہت سے اغلاط موجود ہیں۔[۱۲]

اس کے بعد جنابِ حسرت موہانی نے شیخ محمد اقبال صاحب کے مضمون پر کافی پھُس پھُسے، بلکہ ناروا اعتراضات کیے ہیں۔ مثلاً اقبال نے قلم کو ''کاٹھ کی تلوار'' کہا تو جنابِ حسرت نے لکھا کہ ''قلم کو کاٹھ کی تلوار'' کہنا مناسب نہیں ہے۔''

اقبال نے لکھا: ''شرائط تبدیل ہوتی گئیں۔'' جناب موہانی: ''یہاں ہوتے گئے'' چاہیے'' (راقم الحروف کے خیال میں یہ دقیانوسی اعتراض ہے) ہاں اسی مضمون میں جنابِ حسرت نے مولانا شاد، اور ایک اور مضمون میں فصیح الملک حضرتِ داغ دہلوی کی زبان پر بھی حرف گیری کی ہے۔ انھی باتوں کے پیشِ نظر مجھے کہنا پڑا:

ناوک انداز جدھر حسرتِ موہاں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

اب ۱۹۰۳،۰۴ کے ہندوستان گیر مناقشے میں اُن اساتذہ کی شائع کردہ تحریروں میں سے چند منتخب جُملے پیش کیے جاتے ہیں جنھوں نے پنجاب اور پنجابیوں کی اُردو، یا اقبال کی زبان کی حمایت و تائید کی۔

۱- خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی

اوپر مولانا حالی کے اس تار کا ذکر آ چکا ہے، جس میں انھوں نے منشی محبوب عالم، اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کو لکھا کہ ''.....ایک دن آنے والا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بجائے اُردو کا مرکز لاہور ہو جائے گا.....'' مَیں نے کہیں پڑھا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے بھی اقبال کی حمایت میں اُن دِنوں کوئی بیان دیا۔ وہ بیان تو مجھے نہیں ملا، لیکن اُسی سال (۱۹۰۳ء) میں شائع شُدہ اقبال کی تصنیف علم الاقتصاد کے دیباچے میں شیخ صاحب نے لکھا تھا کہ: ''..... اِس کے علاوہ مخدوم و مکرم جنابِ قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی۔''

۲- مولانا اسلم جیراج پوری (پروفیسر، علی گڑھ کالج)

اب اِن شہروں میں، مثلاً: میرٹھ، آگرہ، مراد آباد، رام پور، بھوپال، بریلی، جون پور، اٹاوہ، کان پور وغیرہ وغیرہ میں اِس [یعنی اُردو] کا رواج ایسا ہی ہے جیسا دہلی یا لکھنؤ میں۔ اِن شہروں کے باشندوں کی ملکی، قومی، مادری، ذاتی زبان، غرض جو کہیے، وہ اُردو ہے۔..... پھر کیا وجہ ہے کہ صرف دہلی اور لکھنؤ والے اہلِ زبان ہوں اور اِن [دوسرے] مقامات کے لوگ اہلِ زبان تسلیم نہ کیے جائیں؟ .....کیا [یہ] انصاف کا خون نہیں ہے کہ دہلی یا لکھنؤ والے اپنے کلام کو مستند سمجھیں، اور دوسرے مقامات کے جو نامی زبان دان ہیں اُن کا کلام غیر مستند ہو؟.....[۱۳]

اس کے بعد، بڑی کشادہ دلی کے ساتھ مولانا اسلم جیراج پوری نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

.....اِن حضرات نے جن کو اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ ہے، زبان کی بہت کم خدمت کی ہے، بلکہ اِن سے تو اِس بابت پنجابی کہیں بہتر ہیں جو اِس کی اشاعت کی رات دن کوشش کرتے ہیں.....[۱۴]

مزید:

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہر ایک شخص جو معقولیت کے ساتھ ترقی زبان میں کوشاں ہے اور مدت سے اس کے یہاں اُردو بولی جاتی ہے، وہ یقیناً اہلِ زبان ہے اور بے شک مستند ہے۔ اگر اَور زبانوں کو دیکھا جائے تو اُن میں بھی یہی بات ہے.....[۱۵]

۳- وجاہت علی صدیقی جھنجھانوی نے بھی اس بحث کا کُشادہ دِل سے جائزہ لیتے ہوئے، مدیر مجلّہ تالیف و اشاعت لاہور کے نام ایک مراسلے میں تحریر کیا:

.....جو ملک [یعنی دہلی وصوبہ جات متحدہ] اُردو زبان کا ماوا و ملجا مشہور ہے، اُس کی کتابیں عام طور پر علمی مذاق اور تہذیب و شائستگی کی چاشنی سے بالکل خالی رہتی ہیں، اور اُن سے زمانے کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی..... [چنانچہ حالات حاضرہ کے بارے میں کوئی] کتاب اگر اہلِ زبان کے ہاں موجود نہ نکلے گی تو مجبوراً اُس [شخص] کو اہلِ پنجاب سے درخواست کرنی پڑے گی۔ اب اگر اس کتاب کا شائق کوئی شخص ایسا ہے جو مضامین کے ساتھ ساتھ زبان و محاوراتِ اُردو کے متعلق بھی تنقید و تحقیق سے کام لیتا ہے۔ تو وہ اِس کتاب کو پڑھتے وقت بہت کچھ ناک بھوں چڑھائے گا اور ایک پنجابی کی تصنیف کردہ کتاب میں اُس کو بہت سے عیوب و اسقام دکھائی دیں گے، مگر جب اہلِ زبان کے پاس اِس مضمون کی کوئی کتاب ہی نہیں تو اُس کو اوّل سے آخر تک جبراً قہراً اِسی کتاب کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اور پنجابی مصنف کو صلواتیں بھی بہت کچھ سُنائی جائیں گی، مگر اِس تمام شوراشوری کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اس کتاب کے بعض پنجابی محاورے کتاب پڑھنے والے کے دل و دماغ میں غیر معمولی طور پر ضرور جگہ کرلیں گے اور اگر پنجابیوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ اِسی طرح روز افزوں ترقی کرتا رہا تو پنجابی زبان اُردو میں ایک معقول تعداد کی حصہ دار بن جائے گی [خدانخواستہ!]، کیونکہ

علمی میدان میں اہل زبان کے گھوڑے تو دوڑ چکے۔ اُن کی رفتار سُست ہوگئی ہے اور اہلِ پنجاب نے جدید علمی تصانیف کا تار باندھ رکھا ہے۔ پس یہ ضروری بات ہے کہ اہلِ پنجاب کی تصنیفات اہلِ زبان سے زیادہ ملک میں اشاعت پذیر ہوں گی اور اُن کے بعض پنجابی محاورات وتلفظ اُردو زبان کے جزوِ لاینفک بن جائیں گے.....[۱۶]

اس ضمن میں جنابِ اقبال کے ایک طویل مقالے بعنوان ''اُردو زبان پنجاب میں'' سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

.....اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملکِ ہندوستان اِس [زبانِ اُردو] کے زیرِ نگیں ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رِواج ہو، وہاں کے لوگوں کا طریقِ معاشرت، اُن کے تمدنی حالات، اور اُن کا طرزِ بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلّم اُصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اِس اُصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری [شاید کورٹ، یا گرجا، ہونا چاہیے] نیلام وغیرہ۔ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلاتکلف استعمال کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی اُردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ، یا کوئی پُر معنی پنجابی لفظ، استعمال کرے تو اُس کو کُفر وشرک کا مرتکِب سمجھو! اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو، مگر یہ مذہبِ منصور ہے کہ اُردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اُردو میں گھُسنے نہ پائے! یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علمِ زبان کے اُصولوں کی صریح مخالف ہے۔ اور جس کا قائم ومحفوظ رکھنا کسی فردِ بشر کے امکان میں نہیں ہے.....[۱۷]

۴۔ اس مناقشے میں حصہ لینے والوں میں ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جاتا ہے جو ایک جید عالمِ اُردو و انگریزی تھے، یعنی مرزا محمد سعید صاحب دہلوی۔ یاد رہے کہ مرزا صاحب موصوف گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد تھے۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ برطانوی حکومت کے زمانۂ عروج، بلکہ بوقتِ نصف النہار، خود انگریزوں کے قائم کردہ، اور ہندوستان کے سب سے بڑے اور اہم ترین کالج میں ایک ہندوستانی شخص کا استادِ انگریزی ہونا کس پائے کی بات تھی!

مرزا محمد سعید دہلوی کے مضمون ''زبانِ اُردو کی اصلاح'' میں سے ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دہلی اور لکھنؤ والوں کی آپس کی رقابت سے جو نقصان اُردو زبان و ادب کو پہنچ رہا ہے وہ سب پر واضح ہے.....تعصب تو دونوں ہی میں ہے۔ لیکن لکھنؤ والوں نے ہمیشہ سے ان معاملات میں زیادہ تنگ خیالی ظاہر کی ہے اور کچھ مدت سے تو دلّی والے بیچارے نسبتاً خاموش ہیں اور منہ زوریاں زیادہ تر لکھنؤ والے ہی کرتے ہیں.....

یہ تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی حَیث بَیث [حَیص بَیص] میں کوئی سچی علمی ترقی نہیں ہوسکتی..... اِس طرح زبان کی محافظت بھی نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً اِس صورت میں کہ ملک کے بعض اور حِصوں مثلاً حیدرآباد اور پنجاب میں بکثرت اُردو کتابیں شائع ہورہی ہیں جن کی زبان نہ دہلی والوں کے نزدیک مستند ہے، نہ لکھنؤ والوں کے۔ یہ کتابیں ملک کے ادب میں دائمی حصہ لیں گی اور آخرکار تمام ملک میں ایک مخلوط زبان (جو ممکن ہے مکروہ بھی ہو) پھیل جائے گی۔ اور دلّی ولکھنؤ والوں کا سب زبان دانی کا فخر جاتا رہے گا.....[18]

اپنے مراسلے کے آخر میں مرزا صاحب نے ایک بڑی اہم تجویز اِن الفاظ میں پیش کی:

.....اس کو روکنے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ ملک کے ادیبوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو اُردو زبان کے محاورات وقواعد کو ترتیب دے اور زبان کی درستی کا ایک معیار قرار دے۔ آیندہ تمام تصانیف کی زبان اِسی مقررہ معیار کے مطابق ہو۔ اِس کمیٹی کے ممبروں کی تعداد محدود ومعین ہو۔ اور اس کے اراکین میں نصف زبانِ دہلی کے حامی ہوں اور نصف زبان لکھنؤ کے۔ مختلف فیہ الفاظ اور محاورات میں بحث کی جائے اور اِن میں سے بعض لکھنؤ کے اختیار کر لیے جائیں اور بعض دہلی کے۔ اختیار کرنے میں فصاحت کو درستی کا معیار قرار دیا جائے اور تعصب کو چھوڑ کر انصاف سے کام لیا جائے۔ یہ کمیٹی ایک مستقل صورت اختیار کرے اور زبانِ اُردو کی قسمت کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا جائے کہ دہلی اور لکھنؤ کے ممبروں کی تعداد مساوی ہو۔ اگر اس قسم کی کمیٹی تجویز کی جائے تو مندرجہ ذیل اصحاب زبانِ دہلی کی حمایت کرنے والوں میں ضرور شامل کیے جائیں: (۱) شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ (۲) شمس العلما مولوی محمد ضیاء الدین صاحب ایل ایل ڈی۔ (۳) شمس العلما مولوی وفاء اللہ صاحب۔ (۴) فصیح الملک نواب میرزا داغ۔ (۵) مولوی الطاف حسین صاحب حالی۔ (۶) مولوی سیّد احمد صاحب مصنف فرہنگِ آصفیہ (۷) شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر مخزن کیونکہ پنجابی بالعموم محاورہ کے بارے میں دہلی والوں ہی کی تقلید کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر خصوصاً شیخ صاحب کی زبان تو مستند ہے۔ اِسی طرح لکھنؤ سے بھی آٹھ ادیب منتخب کر لیے جائیں جن میں اڈیٹر اودھ پنچ، اڈیٹر اُردوئے معلّی، تنقیدِ ہمدرد[19] اور حاجی محمد خاں صاحب[20] ضرور شامل ہونے چاہییں۔[21]

مرزا صاحب نے آخر میں فرمایا کہ: ''یہ تجویز قابلِ عمل ہے کیونکہ فرانس کی مشہورِ آفاق فرنچ اکیڈیمی [Academie Francaise] انھی اُصولوں پر اور انھی مقاصد کی تکمیل کے لیے قائم کی گئی تھی، اور وہ ۱۶۳۶ء سے لے کر آج تک اس کام کو بخوبی سرانجام دیتی رہی ہے۔''[22]

مرزا صاحب موصوف نے بےخبری میں اپنی مجوزہ کمیٹی میں لکھنؤ کی جانب سے جس شخص کو نامزد کیا وہ جناب حاجی محمد خاں تھے جو ٹھیٹھ پنجابی اور موضع جلال پور جٹاں کے باسی تھے۔ مرزا صاحب کو یہ مغالطہ اس لیے لاحق ہوا کہ حاجی محمد خاں صاحب نے اپنے مضمون میں یہ لکھا تھا کہ ایسے پنجابی محاوروں سے ہمارے

کان دُکھتے ہیں۔ حاجی صاحب کے نام کے آگے بی اے، اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ بھی لکھا ہوا تھا اور مجھے بچپن ہی سے یہ معلوم تھا کہ وہ علی گڑھ میں جناب فضل الحسن حسرت موہانی کے یارِ غار تھے، جنھوں نے اُسی زمانے میں علی گڑھ سے اُردوئے معلیٰ کے نام سے ایک مجلّہ شائع کرنا شروع کیا تھا[۲۳] اور چونکہ جناب حسرت زبان کے معاملے میں بہت کٹر تھے۔ بلکہ انھوں نے اپنے مضامین میں مرزا غالب، حضرتِ میر تقی میر، اور حکیم مومن خان مومن کی زبان پر بھی حرف گیری کی ہے، جو اکثر اوقات کٹھ ملّائیت کی حدوں کو چھُو لیتی ہے، اِس لیے جنابِ حسرت کی نکتہ چینیوں کا اُن کے یارِ غار جناب حاجی محمد خاں پر اثر انداز ہونا ایک فطری امر تھا۔

حاجی محمد خاں مرحوم نے علی گڑھ منتھلی جون ۱۹۰۳ء میں شیخ محمد اقبال [جن کی شاعری کا یہ ابتدائی زمانہ تھا] کی زبان کی چند کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا تھا، لیکن اِس کے چند ہی ماہ بعد انھوں نے ایک بڑا عالمانہ مضمون ''اُردو ادب میں فنِ تنقید کی کمی'' کے عنوان سے شائع کیا، جس میں انھوں نے بڑی بالغ نظری اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیتے ہوئے اُس وقت کی اُردو نثر اور نظم کا یورپی زبانوں کے ادب کے تناظر میں جائزہ لیا۔ اِس مضمون کی ایک نقل جناب پروفیسر اکبر حیدری کشمیری سے دستیاب ہوئی ہے۔

اس مضمون میں حاجی محمد خاں مرحوم نے ضِمناً اقبال کی شاعری کے محاسن کے بارے میں بڑی دُور بینی اور نکتہ شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے تعریفی کلمات تحریر کیے۔ اس مضمون کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

> مخزن نے اپنی پیدائش کے ساتھ ہی [یعنی ۱۹۰۱ء میں] اقبال کو منتظرِ نظروں کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ اُس نے آتے ہی ایشیا کے اصلی شاعرانہ خیالات کو مغربی اُسلوب بیان میں کچھ اِس طرح ادا کیا کہ سب عَش عَش کر اُٹھے۔ کہیں تصوف کی گُتھیاں سُلجھائیں، کہیں فطرت کی ظاہر صورت سے اُس کا رازِ نہاں آشکار کیا۔ تخیل کی نگاہ جس چیز پر ڈالی اُسے بالکل نئی اور پہلے سے بڑھ کر پیاری صورت عطا کر دی۔ تاثیر کی یہ کیفیت کہ اکثر ایک ایک مصرع، ایک ایک لفظ، شاعر کی گلخنِ طبع کا شرارہ معلوم ہوتا ہے۔ سالیکہ غلُو ست از بہارش پیداست۔
>
> اقبال کی شاعری میں ابھی سے وہ باتیں پائی جاتی ہیں جن سے اُن کی طرز کی دائمی مقبولیت کا پتا چلتا ہے۔ شعرائے اُردو کی لمبی فہرست میں ایک مرزا غالب ہی ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کو بلحاظِ جذبات و محسوسات کلامِ اقبال پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ اس لیے کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ہم اقبال کو مرزا کا شاگردِ روحانی قرار دیں۔[۲۴]

لیکن اِس کے بعد قابل مصنف بڑی غیر جانبداری اور ژرف بینی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> کلامِ اقبال پر جائز اعتراض بھی ہو سکتے ہیں۔ اکثر اُن کی مشکل پسندی کے سامنے غالب کی مشکل پسندی

سہل معلوم ہوتی ہے۔ اِسی طرح بعض اوقات اِستعاروں اور تشبیہوں کی اعتدال سے بڑھ کر بھرتی اُن کے اشعار کو معمایا چیستان بنا دیتی ہے..... کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی اہلِ زبان کی نظر میں کھٹکتی ہیں۔ کبھی کبھی مضمون کی چستی کے مقابلے میں طرزِ بیان پھُسپھسا معلوم ہوتا ہے اور یہ زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔[۲۵]

اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل ہی میں، کہ اقبال کو ہندوستان کے منظر پر آئے ابھی تین چار سال کا عرصہ ہوا تھا، حاجی محمد خاں کا اِتنی دُور رَس اور نکتہ شناس نگاہوں سے اُس کی شہرتِ دوام کو بھانپ لینا، اور نقد و نظر کی کڑی، مگر متوازِن، ترازو میں اُس کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تول لینا، بہت ہی قابلِ تعریف ہے۔ یہ انتقاد غالباً کلامِ اقبال کی اوّلین (Earliest) قدر گیریوں (Evaluations) میں سے ایک ہے اور اِس نوجوان نقاد کے لیے (جب کہ اس کی اپنی عمر چوبیس برس کے قریب تھی، اور اُس کے موضوع، یعنی اقبال، کی عمر ۲۷ برس کے لگ بھگ تھی) قابلِ صد ناز ہے۔ افسوس کہ یہ ہونہار نقاد زیادہ دیر زندہ نہ رہا اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں اڑتیس (۳۸) برس کی عمر پا کر اِس جہان سے گزر گیا۔ ع

آہ یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر

❁.....❁.....❁

حوالے و حواشی

۱- حاجی محمد خاں بی اے (علیگ) راقم [سعید اختر درانی] کے نانا تھے (جلال پور جٹاں ضلع گجرات، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے ۱۹۰۳ء میں بی اے کیا۔ بہ صیغۂ ملازمت، وہ صوبہ جات متحدہ (یوپی) کے مختلف شہروں (لکھنؤ، میرٹھ، سرو ہنہ اور ہاپڑ وغیرہ) میں محکمہ زراعت کے انسپکٹر رہے۔ عین عنفوانِ شباب (۳۸ برس کی عمر) میں، وہ ۳۱/اکتوبر ۱۹۳۸ء کو انفلوئنزا کی عالمگیر وبا میں فوت ہوگئے۔ ان کے مفصل کوائفِ حیات میں نے اپنے سلسلۂ مضامین (مجلّہ حکیم الامت سری نگر، مئی تا نومبر ۲۰۰۷ء) میں بیان کیے ہیں، جن میں سے بہت سے میرے والد مرحوم جناب عنایت اللہ خان درانی (جو گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہوئے تھے اور پیشے کے لحاظ سے جج تھے) کے سوانح عمری (memoirs) سے اخذ کیے گئے تھے۔

۲- علی گڑھ منتھلی، جون ۱۹۰۳ء۔

۳- یہ مضمون مقالاتِ اقبال (مرتب: سیّد عبدالواحد معینی) آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، میں شامل ہے۔

۴- بحوالہ: اقبال کی صحت زبان (مرتب: اکبر حیدری کشمیری)، نصرت پبلشرز ۱۹۹۸ء۔

۵- پندرہ روزہ تالیف و اشاعت لاہور، یکم جولائی ۱۹۰۳ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۶- ایضاً، یکم جون ۱۹۰۳ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۷- اُردوے معلیٰ، اپریل ۱۹۰۴ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۸- ایضاً، یکم اکتوبر ۱۹۰۳ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۹- ایضاً۔
۱۰- ایضاً، ستمبر ۱۹۰۴ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۱۱- ایضاً۔
۱۲- اُردوئے معلّٰی، نومبر ۱۹۰۴ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۱۳- تالیف و اشاعت، ۱۵/اپریل ۱۹۰۴ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۱۴- ایضاً۔
۱۵- ایضاً۔
۱۶- ایضاً، یکم دسمبر ۱۹۰۳ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۱۷- مخزن لاہور، اکتوبر ۱۹۰۳ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۱۸- تالیف و اشاعت لاہور، ستمبر ۱۹۰۳ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۱۹- یعنی غالباً حکیم برہم فتح پوری۔
۲۰- یعنی حاجی محمد خاں صاحب جنھوں نے اس تمام مباحثے اور مناقشے کا خدنگِ اولین صادر کیا تھا۔
۲۱- تالیف و اشاعت لاہور، ستمبر ۱۹۰۳ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۲۲- ایضاً۔
۲۳- جلال پور جٹاں میں ہمارے آبائی مکان کے اندر ایک کتب خانہ بھی تھا، جس میں مخزن، علی گڑھ منتھلی، اور اُردوئے معلیٰ کے بہت سے رسالے بھی محفوظ تھے۔ جو میں زمانۂ طالبِ علمی میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا اور جن میں میرے مرحوم نانا کے چند مطبوعہ مضامین بھی تھے۔ بالخصوص مخزن لاہور میں۔ اگرچہ اِن رسالوں میں نانا مرحوم کا وہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا تھا جس میں انھوں نے پنجاب کی اور اقبال کی محاورے کی غلطیوں پر گرفت کی تھی۔
۲۴- علی گڑھ منتھلی، فروری ۱۹۰۴ء، بحوالہ: اقبال کی صحتِ زبان۔
۲۵- ایضاً.....اس اقتباس کے آخری ۳، ۴ جملوں کے پیشِ نظر مرزا محمد سعید دہلوی کا جناب حاجی محمد خاں کو لکھنوی، یا کم سے کم اہلِ زبان، سمجھنا قابلِ تعجب نہ ہوگا۔